ہمارے تعلیمی مسائل اور ان کا حل۔ اسلامی تناظر میں

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کا علمی تجزیہ [(۱)]

ڈاکٹر محمد امین [*]

ABSTRACT

Education plays a very important role in the life of individulals, society and the state. Dawa, tarbiya and modern media are also considered informal parts of education. Edcuational issues being confronted by the Pakistani community today are not mere outcome of recent government policies but are rather extension of legacy of our colonial past. Aligarh is the symmbol of Westernized modern education advocated by pro-West Sir Syed Ahamd Khan whereas Deoband is the role model of religious education sponsored by the religious elite of that time. The former is deprived of religious education and tarbiya while the latter ignores secular knowledge and skills.

The need of the hour is that we get rid of this educational dichotomy and develop an holistic educational system integrating healthy aspecths of both these streams so that graduates of general and modern education do benefit from religious norms; and graduates of religious education are also well aware of modern knowledge and skills. We will discuss

(۱) یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کی دوروزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ ۲۳، ۲۲ر فروری ۲۰۱۷ء میں پڑھا گیا

* پروفیسر، شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

these issues in this paper in perspective of Dr. Mahmood Ahmad Ghazi's reflections on this topic.

Keyword: تعلیم، دعوت، تربیت، مذہبی، علی گڑھ، دیوبند

تعلیم ہمیشہ سے فرد، معاشرے اور ریاست کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی آئی ہے۔ اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو دعوت و تبلیغ، تزکیہ و تربیت اور ابلاغ عامہ کے ذرائع بالخصوص آج کا میڈیا بھی تعلیم ہی کا حصہ ہے۔ پاکستان میں آج تعلیم کو جو مسائل درپیش ہیں وہ پچھلی دہائیوں میں محض ہماری حکومتی پالیسیوں کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ تعلیمی نظام بنیادی طور استعماری دور کی یادگار اور اسی کی توسیع ہے۔ استعمار کی حمایت میں اور اس کی حمایت سے ابھرنے والے جدید تعلیم کے نظام کا نمائندہ علی گڑھ ہے اور اس کے رد عمل میں ابھرنے والی مذہبی تعلیم کی نمائندگی دیوبند کرتا ہے۔ اوّل الذکر مغرب زدہ عصری تعلیم مہیا کرتا ہے جس میں دینی تعلیم و تربیت کا موثر اہتمام نہیں ہوتا تو ثانی الذکر میں عصری اور دنیاوی علوم سے اعتناء نہیں کیا جاتا حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ تعلیم و تربیت کو ثنویت کے اس گرداب سے نکالا جائے اور وحدت تعلیم کے اسلامی تصور پر ان دونوں تعلیمی دھاروں کی اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ عمومی اور جدید تعلیم کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو ہو اور دینی تعلیم کے متخصصین عصری علوم، افکار اور تحدیات سے ناواقف نہ رہیں۔ اس مقالے میں ان تعلیمی مباحث پر مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی کے افکار کا علمی تجزیہ کیا گیا ہے۔

تعلیم کی اہمیت و نوعیت[۱]

تعلیم کو بعض لوگ محض دینوی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں جب کہ حقیقتاً یہ کارِ انبیاء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں چار دفعہ فرمایا ہے۔[۲] کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا منہج دعوت ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ تھا اور یہی طریق کار انبیاء سابقین کا تھا۔[۳] اسے آج کی اصطلاح میں تعمیر شخصیت، انسان سازی

(۱) طوالت اور تکرار سے بچنے کے لیے ہم نے اس مقالے میں ہر بات میں ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کے اقتباسات دینے کی بجائے اپنے الفاظ میں ان کا موقف بیان کر دیا ہے اور کتاب کا اور اس کے متعلقہ مضمون کا حوالہ دے دیا ہے۔ ان کے تعلیمی افکار زیادہ تر تعلیم پر ان کے خطبات کے مجموعے 'محاضرات تعلیم' (مرتبہ: ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن) میں یکجا موجود ہیں لہذا ہمارے استفادے کا زیادہ انحصار اسی کتاب پر رہا ہے۔

(۲) البقرہ: ۱۲۹، آل عمران: ۱۶۴، الجمعہ: ۲

(۳) النازعات: ۱۸، الاعلیٰ: ۱۴تا۱۲

یا(Human Development) کہا جاسکتا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کے ذریعے آدمی کو بدلا جائے۔ جس طرح کا آدمی تیار کیا جائے گا اسی طرح کا معاشرہ اور ریاست وجود میں آئے گی۔ اسلام میں تعلیم وتربیت سے مقصود یہ ہے کہ انسان بحیثیت عبد اس دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بسر کرے تاکہ اخروی زندگی میں اس کا خالق ومالک اس سے راضی ہو جائے اور اپنی نعمتوں سے نوازے۔ انسانوں کی اکثریت اگر دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بسر کرے گی تو وہ دنیا میں بھی کامیاب ہو گی اور آخرت میں بھی۔ اس کامیابی کا بنیادی ذریعہ تعلیم وتربیت ہی ہے۔

اس بنیادی اصول سے واضح ہوا کہ اسلام وحدت تعلیم کا تصور دیتا ہے۔ یہ تعلیم اسلامی اصول واقدار پر مبنی ہونی چاہیے۔ معاشرے کو درکار مہارتوں اور تخصصات کے حوالے سے دینی، سماجی اور سائنسی علوم بھی اس کا حصہ ہونے چاہئیں۔ لیکن ہم اپنے تعلیمی حالات پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہماری عمومی اور جدید تعلیم مغرب زدہ ہے۔ دینی علوم کے متخصصین عصری علوم وافکار سے ناواقف ہیں اور وحدت تعلیم کا تصور عنقا ہے۔
ہم ان خرابیوں اور ان کی اصلاح کے حوالے سے ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات کا تجزیہ کرتے ہوئے غور کریں گے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ خرابیاں اچانک پیدا نہیں ہو گئیں بلکہ استعماری دورے سے ہمیں ورثے میں ملی ہیں۔

استعماری دور کا ورثہ

انگریز نے ہندوستان پر صرف جغرافیائی لحاظ ہی سے قبضہ نہیں کیا بلکہ اس نے مقامی لوگوں کے دل ودماغ کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اپنے قبضے کو دوام دے سکے۔ اس غرض سے اس نے مسلم نظام تعلیم کو منہدم کیا۔ ان کے اوقاف ختم کر دیے، فارسی کی بجائے انگریزی کو قومی زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دیا جس سے مسلمانوں کے قائم کردہ مدارس بند ہو گئے جو معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن پیدا کرتے تھے۔ تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں میں اس پر دو طرح کا ردعمل سامنے آیا۔ ایک گروہ نے یہ سوچا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی نہ سیکھی اور جدید مغربی علوم سے استفادہ نہ کیا تو وہ ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ اور دوسرے گروہ نے سوچا کہ اگر مذہبی تعلیم باقی نہ رہی تو مساجد ومدارس ویران ہو جائیں گے اور مسلمانوں میں نکاح اور جنازے پڑھانے والے لوگ بھی نہ ملیں گے اور یوں معاشرے سے اسلام کا نام ہی مٹ جائے گا۔ ان خدشات کے پیش نظر اوّل الذکر گروہ میں سے سر سید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ سکول وکالج قائم کیا جو ترقی کرکے یونیورسٹی بن گیا اور مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کرام نے ۱۸۶۶ء میں دیوبند قائم کیا۔ علی گڑھ بتدریج مغرب زدہ تعلیم کا رول ماڈل بن گیا اور دیوبند ایسی محدود مذہبی تعلیم کا جس میں دنیوی علوم سے

اعتناء نہ کیا جاتا تھا۔ (۱)

پھر بتدریج ان دونوں کی طرز کے بہت سے تعلیمی ادارے ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گئے۔ تاہم ان دونوں تعلیمی دھاروں کے منتظمین کو اپنی فراہم کردہ تعلیم کے یک رخے پن کا احساس تھا چنانچہ علی گڑھ اور دیوبند نے قریب آنے اور باہم استفادے کی کوشش کی لیکن حالات کے جبر نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔

یہاں اس جبر کی کچھ تفصیل دینا بے محل نہ ہو گا مثلاً مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند میں رائج درس نظامی کو مختصر کرنے کا فیصلہ کیا اور اور مدت تدریس دس کی بجائے چھ سال کر دی تاکہ طلبہ درسگاہ سے جلد فارغ ہو کر جدید تعلیم بھی حاصل کریں۔ مولانا کے الفاظ یہ تھے:

"اس کے بعد (یعنی مدرسہ میں دینی تعلیم کے بعد) اگر مدرسہ ہذا کے طلباء سرکاری مدارس میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موثر ثابت ہو گی۔"

اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر کہا تھا:

"اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کی بہتری کی اُمید تو ہے۔"

لیکن روایتی علماء کے احتجاج پر انہیں پرانا نظام بحال کرنا پڑا۔ (۲) مولانا عبید اللہ سندھی (م ۱۹۴۵ء) نے تو دہلی میں باقاعدہ ایک ادارہ 'نظارۃ المعارف' کی بنیاد رکھی تاکہ دیوبند اور علی گڑھ کے تعلیمی اوصاف کو یکجا کیا جا سکے۔ اسی طرح خود دارالعلوم نے ۱۹۲۸ء میں اعلان کیا کہ فلسفہ کی جدید کتابوں کو داخل درس کیا جائے گا لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا۔ (۳) مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۳۳ء میں سلہٹ (مشرقی بنگال) میں قدیم و جدید کا ایک عمدہ نصاب ترتیب دیا تھا (۴) لیکن جب وہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بن گئے تو دارالعلوم کے نصاب میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے۔ اسی طرح آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ (وزیر تعلیم بھارت) نے درس نظامی کی اصلاح اور اس پر نظر ثانی و اضافہ علوم جدیدہ کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس میں مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے جدید نصاب تیار بھی کر لیا لیکن بوجوہ اس کا نفاذ عمل میں نہ آیا۔ (۵)

---

(۱) ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات تعلیم، مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصر حاضر (ص: ۱۵۲ و مابعد)۔

(۲) مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی (۲/۲۹۹) بحوالہ دیوبند کی سالانہ رپورٹ برائے سال ۱۸۷۰ء۔

(۳) ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور جدید تقاضے، المحمود اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء۔

(۴) ڈاکٹر محمد امین، نصاب مدنی، مکتبہ البرہان، لاہور، ۲۰۱۴ء

(۵) اس نصاب کا ایک نسخہ رام پور لائبریری میں آج بھی محفوظ ہے۔ بحوالہ عابد رضا بیدار، ہندوستانی مسلمانوں کی ریفام کے مسائل۔

بعد میں مذہبی تعلیم کی اصلاح کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جدید تعلیم کی اصلاح کے لیے جامعہ ملیہ قائم ہوئی۔ (۱) لیکن عمومی اور مذہبی تعلیم کے ان الگ الگ دھاروں کا رنگ پھیکا نہ پڑا تا آنکہ مسلمانوں نے ایک تاریخی جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان بنالیا تا کہ وہ اپنے عقیدے اور تہذیب کے مطابق اسے اسلامی طرز زندگی کا گہوارہ بنا سکیں۔

پاکستان بننے سے جو بنیادی تبدیلی واقع ہوئی اس کے نتیجے میں پاکستانی ریاست وحکومت کو پورے معاشرے کی اور خصوصاً نظام تعلیم کی اسلامی تقاضوں کے مطابق تشکیل نو کرنی چاہیے تھی اور مذہبی تعلیم دینے والے مدارس کو بھی اپنا ڈھب بدلنا چاہیے تھا لیکن بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ استعمار نے چالاکی یہ کی کہ نو آزاد ممالک میں اقتدار اُن طبقات کے سپرد کیا جو اس کی فکر وتہذیب کے پروردہ اور شائق تھے اور نئے ملک میں اسی کو غالب رکھنا چاہتے تھے۔ جب علماء کرام نے دیکھا کہ حکومت نظام تعلیم کی اصلاح اور اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق بدلنے میں دلچسپی نہیں رکھتی تو انہوں نے بھی بادل نخواستہ اسی محدود مذہبی تعلیم کو جاری رکھا جو وہ قیام پاکستان سے قبل سے دیتے چلے آرہے تھے۔

پاکستانی حکومتوں اور علماء کے اس طرز عمل نے تعلیم کے مسئلے کو مزید پیچیدہ اور گھمبیر بنادیا۔ ملک کے دردمند حلقے اور اہل علم وفضل اس پر غور بھی کرتے رہے، دونوں گروپوں کو اصلاح پر مائل بھی کرتے رہے اور اصلاح کے لیے تجاویز بھی دیتے رہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ان اصحاب عمل وفکر میں سرفہرست تھے جنہوں نے اس بات کو اہمیت دی اور نہ صرف تعلیمی اصلاح کے لیے سوچا، لکھا اور بولا بلکہ اس پر عمل درآمد کی کوشش بھی کی۔ (۲)

نظام تعلیم کی اصلاح کے حوالے سے اگر ہم ڈاکٹر غازی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر کو سامنے رکھیں تو وہ تین امور پر ترکیز کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک وحدت تعلیم کا تصور۔ دوسرے عمومی اور جدید تعلیم کی اسلامی تشکیل نو اور تیسرے دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح۔ سطور ذیل میں ہم ان تینوں نکات کی کچھ تفصیل بیان کریں گے۔

وحدت تعلیم کا تصور

دین اسلام چونکہ خود وحدت پر مبنی ہے اس لیے وہ انسانی زندگی کو بھی ایک اکائی کی صورت میں دیکھتا ہے۔ وہ

---

(۱) اس کی تاسیس علی گڑھ میں ہوئی لیکن یہ بعد میں دہلی منتقل ہو گئی۔ آج کل یہ ایک پبلک سیکٹر یونیورسٹی ہے۔

(۲) جب وہ کچھ عرصہ مرکز میں وزیر مذہبی امور رہے تو انہوں نے مدرسہ بورڈ قائم کیا اور کئی ماڈل دینی مدارس بھی قائم کیے۔ لیکن جیسا کہ ہمارے ملک میں چلن ہے، ان کے وزارت چھوڑنے کے بعد اس تجربے کا حشر بھی جامعہ عباسیہ جیسا ہوا اور یہ ادارے اب غیر فعال ہیں اور مؤثر طریقے سے کام نہیں کر رہے۔

دین و دنیا میں کوئی تفریق نہیں کرتا اور سیکولرزم کی نفی کرتا ہے۔ لہٰذا مسلم نظام تعلیم بھی وحدت پر مبنی ہوتا ہے گو تعلیم کے مختلف مراحل اور تخصصات کے لحاظ سے درجہ بندی اور مقامات تدریس مختلف ہو سکتے ہیں لیکن عملی و فکری وحدت پھر بھی برقرار رہتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی استعمار کے قبضے میں جانے سے پہلے کے تقریباً بارہ سو سال تک مسلمانوں کا نظام تعلیم موحد رہا ہے اور مسلم نظام تعلیم کا مذہبی اور دنیاوی تعلیم میں تقسیم ہو جانا یہ مغربی استعمار کی خواہش یا اس کے خلاف رد عمل کا نتیجہ ہے جب کہ مسلمان اپنی خود مختاری کھو چکے تھے اور اس صورت حال کا جاری رہنا بھی دراصل مغربی استعمار کی کوششوں، سازشوں اور خواہشوں ہی کا نتیجہ ہے۔[۱] ڈاکٹر غازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ابتداء میں مغربی استعمار کے خلاف مسلمانوں کا ردّ عمل دو انتہاؤں کی طرف مائل تھا۔ ایک مکمل ردّ اور دوسرے مکمل قبولیت۔ مکمل ردّ کا مظہر دیوبند تھا اور مکمل قبولیت کا علی گڑھ، تاہم یہ دونوں ردّ عمل بتدریج کمزور ہو کر خذ ماصفا ودع ماکدر کی صورت میں معتدل ہوتے گئے۔[۲] چنانچہ دیوبند میں اصلاح کے لیے ندوۃ العلماء لکھنو اور علی گڑھ کی اصلاح کے لیے جامعہ ملیہ دہلی وجود میں آئی۔ تاہم ان کا کہنا یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اس تعلیمی ثنویت کو جاری رکھنے کا کوئی جواز تھا، نہ ہے لہٰذا اب اس ثنویت کو وحدت میں تبدیل ہو جانا چاہیے۔

جدید تعلیم کی تشکیل نو

ڈاکٹر غازی رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیم سے متعلق اپنے کئی محاضرات میں مسلم برصغیر کے نظام تعلیم کی تاریخ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[۳] اور یہ بتایا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک برصغیر کا نظام تعلیم، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے باوجود، اپنی ہیئت اور شناخت قائم رکھے ہوئے تھا، وحدت کے تصور پر مبنی تھا اور معاشرے اور ریاست کی دینی، سیاسی، انتظامی اور سماجی ضروریات پوری کر رہا تھا۔ تاہم ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی طرف سے جنگ مزاحمت نے برطانیہ کو مشتعل کر دیا۔ اس نے زمام اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے اپنے ہاتھ میں لے لی، مسلمانوں کو قوت سے کچل ڈالا اور ان کے قائم کردہ تنظیمی، عسکری، سیاسی، قانونی، عدالتی اور خصوصاً تعلیمی ڈھانچے کو منہدم کر دیا اور اس کی جگہ اپنے نظریات کے مطابق ان کی تشکیل نو کی۔ اس نے مسلم اوقاف کو ختم کر دیا جو مسلم نظام تعلیم کی ریڑھ کی ہڈی کی مانند تھے، قومی زبان فارسی کو عربی سے بدل ڈالا اور اسے ہی ذریعہ تعلیم بنا دیا جس کی وجہ سے مسلمان علماء اور

---

(۱) ڈاکٹر محمد امین، ہمارا دینی نظام تعلیم، تعلیمی ثنویت کے خاتمے کا طریق کار، مکتبہ البرہان، لاہور، طبع دوم ۲۰۱۴ء (ص: ۲۳۳)۔

(۲) محاضرات تعلیم، مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصر حاضر (ص: ۱۴۸ و مابعد)

(۳) شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (ص: ۸۸)۔

معلمین ناکارہ ہو کر رہ گئے اور سرکاری ملازمتوں کا دروازہ ان پر بند ہو گیا اور "پڑھیں فارسی بیچیں تیل" کا محاورہ وجود میں آ گیا۔ ان حالات میں سرکاری مدارس کے تتبع میں مسلمانوں میں سے سرسید نے علی گڑھ کی بنیاد رکھی اور اگرچہ ان کا اعلان کردہ تصور یہ تھا کہ اس ادارے میں جدید سائنس طلبہ کے بائیں ہاتھ میں، فلسفہ ان کے دائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ کا تاج ان کے سر پر ہو گا۔[۱] لیکن فکری مرعوبیت اور استعمار کی مدد سے جو نظام تعلیم عملاً سامنے آیا وہ مغرب زدہ تھا اور اس میں اسلامیت برائے نام اور غیر موثر تھی اور سائنس و ٹیکنالوجی بھی اس میں موجود نہ تھی۔[۲]

پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہے اس نظام تعلیم کے جاری رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اسلامی تناظر میں اس کی تشکیل نو ضروری تھی لیکن بد قسمتی سے یہ کام نہ حکومت نے کیا اور نہ علماء کرام نے چنانچہ علی گڑھ کی طرز پر جدید و معاصر علوم کے تعلیمی ادارے (سکول، کالج اور یونیورسٹیاں) وجود میں آتے اور پھیلتے چلے گئے۔ ان تعلیمی اداروں میں نہ صرف یہ کہ علوم و تعلیم کی مکمل اسلامی تشکیل نو کی کوشش نہ کی گئی اور محض دخل اندوزی (Patch Work) سے کام چلایا گیا بلکہ اسلامیات کی بطور ایک مضمون کے تدریس بھی ناقص اور غیر موثر رہی۔ حکومتوں اور اشرافیہ نے تعلیم کو نہ تو عام ہونے دیا اور نہ اس کے اسلامی مزاج کو پختہ ہونے دیا بلکہ اس غیر موثر ملغوبے پر بھی بتدریج انگریزی زبان اور مغربی کلچر کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ تعلیم کو طبقات میں تقسیم کر کے کاروبار بنا دیا گیا۔ اکسفورڈ کی نصابی کتب کو فروغ دیا گیا اور تعلیم کی نظریاتی وحدت کے خاتمے کے لیے اسے مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار سے نکال کر صوبوں کے سپرد کر دیا گیا۔ جب تک اسلام اور قوم و ملت کا درد رکھنے والے لوگ اس تعلیمی صورت حال کی اصلاح کے لیے نہیں اٹھیں گے ثنویت اپنا زہر پھیلاتی رہے گی۔[۳] علوم کی اسلامی تشکیل نو کے لیے ڈاکٹر غازی رحمۃ اللہ علیہ، شہید ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی[۴] کے دس نکاتی لائحہ عمل کی حمایت کرتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں[۵] کہ مغربی علوم اور خصوصاً اس کے سماجی علوم کی اسلامائیزیشن کی بجائے ہمیں عمرانی علوم کی

---

(۱) محاضرات تعلیم، اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے (ص: ۱۷۴)۔

(۲) محاضرات تعلیم، دینی تعلیم اور عصر حاضر میں اس کی معنویت (ص: ۵۱ وما بعد)۔

(۳) محاضرات تعلیم، مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج (ص: ۲۹۴ وما بعد)۔

(۴) بانی ڈائریکٹر بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی، ورجینیا (واشنگٹن، امریکہ)

(۵) ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی، علوم جدید کی اسلامی تشکیل۔ عمومی اصول اور خطوط کار (مترجم: پروفیسر سید محمد سلیم) طبع ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اسلامی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

اسلامی تناظر میں تشکیل نو (Reconstruction) پر زیادہ توجہ دینا ہو گی۔[۱]

ہماری اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ علوم کی اسلامائیزیشن کے لیے ڈاکٹر راجی الفاروقی کے دس نکات پر ایک نظر ڈالیں جو تلخیصاً یہ ہیں:

۱۔ جدید مغربی علوم پر کامل دسترس
۲۔ مغربی علوم وفنون کا تجزیاتی مطالعہ
۳۔ مغربی علوم کا تنقیدی محاسبہ
۴۔ مسلم فکر و دانش کی کامل تفہیم
۵۔ اسلامی علوم کا تجزیاتی مطالعہ
۶۔ مسلم علوم پر ایک تنقیدی نظر
۷۔ مغربی اور اسلامی علوم وفنون کا تقابلی مطالعہ
۸۔ امت کو درپیش اہم مسائل کا جائزہ
۹۔ دنیا کو درپیش مسائل کا استحضار
۱۰۔ مغربی اور اسلامی علوم میں ایسی ہم آہنگی اور امتزاج جو امہ اور عالم انسانیت کے مسائل حل کر سکے۔

ڈاکٹر فاروقی کی اس سکیم کو اگر ہم مغرب کے عمرانی علوم کی اسلامائیزیشن (Islamization of Western Knowledge) یا مغرب کے فکری و تہذیبی غلبے اور بہت سے مسلم اہل علم کی مغرب سے فکری مرعوبیت کی وجہ سے اسے 'اسلامی علوم کی مغربائیزیشن (Westernization of Islamic Knowledge) کہیں تو یہ بے جا نہ ہو گا کیونکہ ایک ہزیمت خوردہ فکر و تہذیب (جو کہ اس وقت بدقسمتی سے ہم ہیں.... اور یہ بات گو تلخ ہے لیکن زمینی حقیقت بہر حال یہی ہے) جب ایک غالب فکر و تہذیب سے مکالمہ کرتی ہے اور تنسیق و تلفیق (Reconciliation) پر اترتی ہے تو اس کا راستہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر غالب تہذیب سے مغلوبیت ہی کی طرف جا کھلتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمیں مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علوم و معارف کو اصولی طور پر ردّ کر دینا چاہیے کیونکہ مغربی فکر و تہذیب کے بنیادی نظریات (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم وغیرہ) اور اس کا ورلڈ ویو (تصور الٰہ، تصورِ کائنات اور تصورِ انسان) اور فلسفۂ علم (جو وحی کی حتمیت کو رد کرتا اور انسانی عقل و حواس اور تجربہ و مشاہدہ کو واحد حق قرار دیتا ہے) نہ صرف اسلام سے مختلف ہیں بلکہ اس سے متضاد ہیں۔ اور تلفیق و امتزاج دو ہم جنس و ہم مزاج عناصر میں ممکن ہوتا ہے نہ کہ باہم متخالف و متضاد عناصر میں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مغربی فکر و تہذیب اور علوم و معارف کی حامل مغربی قوتوں کا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور جارحیت پر مبنی ہے۔ انہوں نے مسلم ممالک کو باہم لڑایا، ان کا سیاسی ڈھانچہ (خلافت) توڑا (یا

---

(۱) اس پر ہمارے تفصیلی موقف کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'، بیت الحکمت، لاہور، طبع اول، ۲۰۰۵ء

تڑوایا)، اکثر مسلم ممالک کو غلام بنایا، انہیں لُوٹا، کچلا اور انہیں مستقل غلام بنائے رکھنے کی منصوبہ بندی کی۔ تاریخ کے جبر نے مسلمان ممالک کو ان سے آزادی دلائی تو انہوں نے پُرامن طریقے سے مسلمان معاشرے پر اپنی فکری دہشتگردی کی یلغار جاری رکھی۔ اس کے باوجود جب بعض مسلم ممالک اس کے قابو میں نہ آئے تو اس نے اپنی حربی، سیاسی، معاشی اور میڈیا کی برتری سے عراق، افغانستان، شام اور یمن کو جس طرح تباہ کیا اور پاکستان، ترکی، نائیجریا کا جو حشر کیا، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ ان حالات میں مغرب سے علمی و فکری مفاہمت، ذہنی غلامی ہی کی ایک صورت ہوگی۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش جو نہ دے اس کو قوت و شوکت کا پیام

لہٰذا ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہمیں اصولی طور پر مغربی فکر و تہذیب کو رد کر دینا چاہیے۔[۱] اور اپنے سنہرے ماضی کے تجربات و نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے علوم و معارف کا احیاء اور ان کی تشکیل نو کرنی چاہیے۔ اور اس میں اپنے اصولوں اور ترجیحات کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ہاں! اس پراسیس کے دوران ہم مغرب کی علمی و فکری ترقی کو ضرور سامنے رکھیں گے اور اس سے محتاط و محدود استفادے سے بھی نہ جھجکیں اور اس میں اگر کوئی ایسی چیز ہو جو ہمارے لیے مفید اور ناگزیر ہو اور وہ ہمارے اصولوں، ترجیحات اور مقاصد کے خلاف نہ ہو تو اسے اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر فاروقی کی مغرب کے عمرانی علوم کی اسلامائیزیشن پر ایک تنقید اس حوالے سے بھی ہوئی ہے کہ یہ محض عمرانی علوم کی اسلامائیزیشن کی بات کرتی ہے اور اسلامائیزیشن آف سائنس کو زیر بحث نہیں لاتی جب کہ بعض مسلم دانشور (جیسے ہمارے ہاں ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ) عمرانی علوم کے مقابلے میں سائنس کی اسلامائیزیشن کو زیادہ اہم قرار دیتے ہیں۔[۲]

اس کام کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ڈاکٹر غازی مرحوم کہتے ہیں:

> "علوم کی تنقید و تنقیح کے اس عظیم الشان کام کے لیے اب تاریخ ہمیں شاید مزید مہلت نہ دے۔ اگر مستقبل قریب میں بھی ہم کچھ کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو خیر ورنہ اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب کا احیاء ایک خواب و خیال ہو کر رہ جائے گا بلکہ تغیر پیہم کی اس دنیا میں ہمارے لیے اپنا ملی وجود باقی رکھنا بھی ممکن نہ رہے گا"۔[۳]

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش'، مکتبہ البرہان، لاہور۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق عجمی 'اقبال اور رفیع الدین۔ علوم کی اسلامی تشکیل کا مسئلہ' (ڈاکٹریٹ کے مقالے کا باب چہارم)

(۳) ماہنامہ فکر و نظر، اسلام آباد، مئی ۱۹۷۶ء

دینی مدارس کی اصلاح

ڈاکٹر غازی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ درس نظامی کے فاضل تھے اور عمر بھر اسلامی علوم میں تحقیق و تدریس ہی ان کا پیشہ اور مشن رہا۔ لہٰذا ان کے طبع شدہ 'محاضرات تعلیم' میں اکثر خطبات دینی مدارس کے نظام تعلیم پر ہیں اور ان مدارس کی اصلاح کے لیے انہوں نے متعدد تجاویز پیش کی ہیں۔ دینی مدارس کی اصلاح کے حوالے سے ان کے تجزیے اور تجاویز کا خلاصہ ذرج ذیل ہے:

۱۔ دینی مدارس کا اپنی تعلیم کو بنیادی مذہبی علوم تک محدود رکھنا اس وقت کے مخصوص حالات اور مجبوری کی وجہ سے تھا کیونکہ یہ مدارس استعماری حکومت کے لیے رجال کار تیار اور مہیا کرنا نہیں چاہتے تھے اور حکومت اور اوقاف کے خاتمے کے بعد اور عوام کی گرگوں مالی حالت کے پیش نظر ان کے پاس مادی اور مالی وسائل کی شدید کمی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد حالات میں بنیادی تبدیلی آئی اور اب اُس پالیسی کو، جو وقتی طور پر بنائی گئی تھی، جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا اور اب نئے تقاضوں کے مطابق نظام و نصاب کا بدلنا ضروری تھا اور ہے۔[۱]

۲۔ نئے تقاضوں، اصلاح، وحدت تعلیم کے تصور اور مدارس کو قومی تعلیمی دھارے (Mainstreaming) میں لانے کا مطلب یہ نہیں کہ مدارس کی دینی تعلیم کے متخصص ادارے ہونے کی حیثیت ختم کر دی جائے بلکہ یہ ہے کہ دینی تعلیم جدید تقاضوں کے مطابق دی جائے۔ یعنی دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء جدید علوم و معارف کا تفہیمی اور ناقدانہ مطالعہ رکھتے ہوں تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات میں مسلم عوام کی موثر دینی رہنمائی کر سکیں۔[۲]

۳۔ اس وقت دینی مدارس کا درس نظامی کے نام سے ایک ہی نصاب ہے۔ ڈاکٹر غازی مرحوم کی رائے یہ تھی کہ اس نصاب کے تین گروپ ہونے چاہئیں۔ ایک مساجد کے امام اور خطیب تیار کرنے کے لیے۔ اس کے لیے میٹرک کے بعد تین چار سال کا نصاب کافی ہے جس میں حفظ و تجوید، تفسیر، حدیث اور فقہ میں اردو کی ایک دو بنیادی کتب۔ حسب ضرورت عربی زبان، اور جدید معاشیات و سیاسیات پر ایک آدھ کتاب شامل ہو۔ دوسرا گروپ سکولوں کالجوں میں تدریس اسلامیات کے اساتذہ تیار کرنے کے لیے ہو۔ اس کے لیے ابتدائی تین چار سال کے بعد مزید تین سال کا ایک نصاب ہونا چاہیے جس میں عربی ادب کی چند کتابیں، سیرت، تاریخ اسلام، اسلامی معاشیات، فقہ و عقائد کے ساتھ تفسیر و حدیث بقدر ضرورت اور تاریخ پاکستان اور جدید دنیائے اسلام سے واقفیت پر مبنی مطالعاتی مواد شامل ہونا چاہیے۔ تیسرا گروپ وہ ہو جس میں دینی مدارس کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیق و تدریس کے

---

(۱) محاضرات تعلیم، مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصر حاضر (ص:۱۵۳ومابعد)۔

(۲) محاضرات تعلیم، دینی مدارس، مفروضے، حقائق اور لائحہ عمل (ص:۷۹ومابعد)۔

لیے درکار مفسرین، محدثین، فقہاء اور مفتی تیار کیے جائیں۔ اس کے لیے ابتدائی تین چار سال کی دینی تعلیم کے بعد چار پانچ سال کی مزید تخصصی تعلیم ہونی چاہیے۔ [۱]

سطور بالا میں ہم ڈاکٹر غازی مرحوم نے درس نظامی کے ایک نصاب کی بجائے جن تین گروپوں اور ان کے الگ الگ نصابات کا ذکر کیا ہے، ہم آگے بڑھنے سے پہلے اس پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بعض تقاریر میں اس موضوع پر ایک عمومی گفتگو کی ہے لیکن نصاب سازی کے حوالے سے یہ ایک اہم موضوع ہے اور اس پر ذرا باریک بینی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حسن اتفاق سے یہ ہماری دلچسپی اور تخصص کا دائرہ ہے، اس لیے ہم اس حوالے سے ٹھوس اور تفصیلی تجاویز پیش کرنا چاہیں گے :

۱۔ سکول کی بارہ سال تعلیم میں اتنی دینی معلومات دینا اور ان پر عمل کروانا لازمی ہونا چاہیے جن کی ہر مسلمان کو ضرورت ہوتی ہے (اور جسے علماء کرام 'الدین بالضرورۃ' کہتے ہیں) اس میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

- پری سکول میں تدریس قرآن کے ضمن میں عربی پڑھنا سیکھنے کے دوران تصحیح مخارج کا اہتمام۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پڑھانے والا قاری مجود یعنی ماہر تجوید ہو۔ اس کے لیے آڈیو ویڈیو کا استعمال بھی ضروری ہے۔
- پرائمری میں ناظرہ قرآن ختم کرنا، مڈل و میٹرک میں سارے قرآن حکیم کا ترجمہ اور اعلیٰ ثانوی میں مضامین و احکام قرآن اور تفاسیر کا تعارف شامل ہو۔ مطالعۂ نصوص کے حوالے سے کچھ احادیث بھی مطالعۂ قرآن کا لازمی جزو ہونی چاہئیں۔
- تیسری جماعت سے دسویں تک عربی ہلکے پھلکے انداز میں اور جدید طریق تدریس سے لازمی ہو تاکہ ہر مسلمان کے لیے قرآن فہمی کی پختہ بنیاد مہیا ہو جائے۔
- علوم اسلامیہ (جسے دینیات یا اسلامیات بھی کہتے ہیں) کا نصاب سکول سطح پر وسیع تر ہو۔ عقائد میں اللہ کے ساتھ بندے کے تعلق (توحید) اور آخرت کے تصور پر ترکیز ضروری ہے تاکہ اللہ سے محبت اور اس کی خشیت اور فکر آخرت بچے کی ذہن سازی کا لازمی حصہ بن جائے۔ نیز دینی احکام پر عمل کی مشق کرائی جائے، مطلب یہ کہ طلبہ کو نماز رٹا دینا اور وضو کا طریقہ بتا دینا کافی نہیں بلکہ اسلامیات کا استاد اپنی نگرانی میں بچوں سے وضو کروائے، انہیں نماز پڑھوائے اور انہیں نماز کا عادی بنائے۔ جو نماز سکول میں آتی ہے، ساری جماعت بلکہ سارا سکول وہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرے۔

۲۔ سکول سطح پر تخصص اس وقت بھی موجود ہے جیسے میٹرک میں آرٹس اور سائنس گروپ اور اعلیٰ ثانوی میں سائنس میں پری میڈیکل اور پری انجینئرنگ اور عمرانی علوم کے بے شمار گروپ بشمول درس نظامی گروپ۔

(۱) محاضرات تعلیم، تعلیم مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج اور علماء کی ذمہ داریاں (ص: ۳۱۸،۳۲۳)۔

جب ہم نے مڈل کیا تھا(یعنی ۱۹۶۱ء میں) تو اس وقت ایک چھوٹے قصبے کے گورنمنٹ سکول میں بھی تخصص موجود تھا۔ یعنی چھٹی سے انگریزی لازمی تھی اور عربی وفارسی میں سے ایک اختیاری مضمون لینا ہوتا تھا(چنانچہ اس وقت راقم نے فارسی پڑھی تھی[کہ عربی ٹیچر موجود ہی نہ تھا] جس کے اچھے اثرات آج بھی اس پر موجود ہیں)۔

لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ اسلامیات کے ایک عمومی لازمی نصاب کے ساتھ ساتھ چھٹی سے اسلامیات کے الگ تخصص کی بنیاد رکھ دی جائے جس میں عربی اور اسلامیات کے ایڈوانس (یا اختیاری) کورس الگ سے شامل نصاب ہوں۔ حفظِ قرآن بھی شامل ہو اور یہ سلسلہ تخصص مڈل، میٹرک اور ایف اے تک چلے۔

سکول سطح پر ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ انگریزی سب کے لیے اختیاری مضمون ہو تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ انگریزی زبان اسلامیات گروپ کے طلبہ کے لیے لازمی ہونی چاہیے تاکہ علماء کرام مستقبل میں مغربی فکر وتہذیب کو اس کے انگریزی ماخذ سے براہ راست پڑھ کر سمجھ سکیں اور علمی سطح پر اس کارد کر سکیں۔

۳۔ دینی مدارس کو سکول سطح کی تعلیم دینے کی اجازت ہو خصوصاً اسلامیات کے تخصص کے ساتھ۔ یاد رہے کہ دینی مدارس اس وقت بھی ثانویہ عامہ اور خاصہ کرواتے ہیں لیکن حکومت انہیں میٹرک وایف اے کے برابر تسلیم نہیں کرتی کیونکہ ان میں صرف مذہبی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہماری تجویز کے مطابق اگر مدارس ثانویہ عامہ وخاصہ کرائیں گے تو حکومت ان کی ڈگریوں کو تسلیم کرلے گی اور دینی مدارس کے بچے ہر طرح کی اعلیٰ تعلیم اور ملازمتوں کے اہل ہوں گے۔ حکومت کو چاہیے کہ سکول سطح پر اسلامیات کے تخصص کے مضامین کی نصاب سازی کے وقت علماء کرام کو بھی شامل مشورہ رکھے اور ان کی تجاویز کو اہمیت دے۔ اور بالفرض اگر علماء کرام ناگزیر سمجھیں اور حکومت ان کی نصابی تجاویز نہ مانے تو وہ اپنی طرف سے کچھ اضافی دینی مضامین اپنے طلبا کو پڑھا سکتے ہیں اور ان کا خود امتحان لے سکتے ہیں۔

۴۔ ایف اے کے بعد چار سالہ بی ایس (آنرز)[آرٹس کے مضامین کو بھی BS کہنا سمجھ سے بالاتر ہے]۔ آرٹس میں گریجوایشن کرنے والوں کو بی اے (آنرز) اور اسلامیات گروپ کو بی اے آئی (آنرز) (یعنی بی اے اسلامیات) کہنے میں آخر کیا حرج ہے؟] اس وقت بھی اسلامیات میں میجر کے ساتھ ہو رہا ہے۔

دینی مدارس کو چاہیے کہ وہ یہ چار سالہ بی ایس اسلامیات کروائیں اور طلبہ کو حکومت کی منظور شدہ ڈگری دیں۔ اس کے نصاب کے لیے وہ حکومت سے ٹھوس مذاکرات کریں اور بالفرض اگر حکومت ان کی مرضی کا نصاب نہ بنائے تو وہ حکومتی نصامب کے ساتھ اپنے مضامین کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے علم میں ہے کہ لاہور کے بعض مدارس میں یہ تجربہ ہوا ہے اور کامیاب رہا ہے۔ طلبہ کو حکومتی سند بھی مل جاتی ہے اور طلبہ چونکہ مدرسہ میں مقیم ہوتے ہیں لہٰذا انہیں اضافی مضامین کی تدریس بوجھ بھی محسوس نہیں ہوتی۔

۵۔ دینی مدارس کو چاہیے کہ وہ علوم اسلامیہ کے علاوہ طلبہ کو دیگر عمرانی علوم میں بھی چار سالہ BS اور اس کے بعد ۲ سالہ MS (یا ایم فل) کروائیں۔ وہ طلبہ کو یہ مضامین اسلامی تناظر میں پڑھائیں اور ضرورت سمجھیں تو

انہیں اضافی اسلامی مواد بھی پڑھائیں تا کہ انہیں متعلقہ عمرانی مضمون کے ساتھ علوم اسلامیہ میں بھی درک حاصل ہو جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ / علماء زندگی کے سارے میدانوں میں کام کر سکیں گے اور ملازمت حاصل کر سکیں گے۔ اس طرح دینی مدارس کے تیار کردہ علماء اور سکالرز معاشرے اور ریاست میں پہنچ کر مفید اخلاقی اور دینی اثرات پیدا کر سکیں گے اور یہ دعوت و تبلیغ کا بھی ایک منفرد انداز ہو گا۔

۶۔ اگر ہماری مجوزہ بالا اسکیم کو سامنے رکھا جائے تو مساجد کے علماء و خطباء کی تیاری کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہائر سیکنڈری یعنی ثانویہ خاصہ پاس طلبہ کو بی ایس / بی اے آنرز میں داخلہ دیا جائے اور دو سالہ بی اے کے بعد انہیں فارغ کر دیا جائے۔ اس دو سال کے دوران دینی مدارس اپنے مقیم طلبہ کو دو چار اضافی مضامین پڑھا کر (جیسے تقریر کی مشق اور نماز روزے کے روز مرہ فقہی مسائل وغیرہ) امام و خطیب کورس کی ڈگری دے سکتے ہیں اور یہ طلبہ / علماء ملازمت ملنے کے بعد اپنا BS / بی اے آنرز پاس کر کے اعلیٰ تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ چار سالہ بی ایس / بی اے (آنرز) (جو ایک لحاظ سے دو سالہ عالیہ اور دو سالہ عالمیہ کا مجموعہ ہے) کے بعد شہروں کے بڑے دینی مدارس، جن کے پاس وسائل موجود ہیں، وہ دو سالہ ماجستیر (ایم فل) علوم اسلامیہ کروائیں۔ اس مرحلے پر تعلیمی ادارے HEC کے مجوزہ نصابی خطوط کو سامنے رکھنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافے کر سکتے ہیں (اور ہمارے علم میں ہے کہ کئی یونیورسٹیاں ایسا کرتی ہیں جس پر HEC معترض نہیں ہوتا) لہٰذا دینی مدارس اپنے مقیم طلبہ کو اضافی درسی مواد دے کر ان میں رسوخ فی العلم پیدا کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا دینی مدارس اس سطح پر بھی علوم اسلامیہ کے ساتھ عمرانی علوم میں ڈگری آفر کر سکتے ہیں اور یہ دین کی بڑی خدمت ہو گی کہ وہ معاشرے اور ریاست کو ایسے علماء و سکالرز مہیا کریں جو زندگی کے سارے شعبوں میں کام کر سکیں۔

بی ایس / بی اے (آنرز) پاس طلبہ گورنمنٹ اور پرائیویٹ سیکٹر کے سکولوں اور میٹرک، ایف اے (تخصص علوم اسلامیہ) کرانے والے دینی مدارس میں پڑھا سکتے ہیں۔ جب کہ ماجستیر (ایم فل علوم اسلامیہ) پاس طلبہ کالجوں میں اسلامی علوم / عمرانی علوم پڑھا سکتے ہیں۔

۷۔ بڑے شہروں کے باوسائل دینی مدارس (جامعات) کو مزید تخصص یعنی علوم اسلامیہ میں چار سالہ پی ایچ ڈی بھی آفر کرنی چاہیے تا کہ دینی علوم میں رسوخ رکھنے والے محقق، مفسر، محدث اور فقیہ پیدا ہو سکیں جو یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور پی ایچ ڈی کا تخصص آفر کرنے والے دینی مدارس میں پڑھا سکیں گے اور اگر دینی مدارس، ہماری تجویز کے مطابق، اس کا دائرہ عمرانی علوم تک وسیع کر سکیں (جو انہیں ضرور کرنا چاہیے جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۳۳ء میں تجویز کیا تھا [ملاحظہ ہو مولانا مرحوم کا مدونہ نصاب مع تشریحات از مدیر البرہان، مطبوعہ مکتبہ البرہان، لاہور] تو وہ وقت جلد آ سکتا ہے جب یونیورسٹیوں میں اور سی ایس ایس کر کے بیوروکریسی میں جانے والوں کی اکثریت دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ پر مشتمل ہو گی۔ اور یہ دینی مدارس کی